قرآنی و غیر قرآنی اسلوبِ زندگی کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر سعید احمد سعیدی *

غلام محی الدین **

انسان اپنی تخلیق کے تمام مراحل میں قدرت کی فیاضی کا مرہون منت ہے، اس احتیاج کا سلسلہ روح کی تخلیق سے شروع ہو کر باپ سے ماں کے رحم تک پہنچتا ہے اور پھر خالق کائنات جملہ صلاحیتوں سے نواز کر اس دار فانی میں ظہور عطا فرماتا ہے۔ پھر ان صلاحیتوں کے نکھار کا تعلق مختلف شخصیات اور اداروں سے جڑ جاتا ہے۔ قدرت کے شاہکار اس ہیرے کو جتنا تراشا جائے اتنا ہی قیمتی ہو کر سامنے آتا ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت جس قدر عمدہ ہو گی، معاشرے کو اسی قدر مہذب و منظم شخصیت مہیا ہو گی۔

چونکہ انسان کی جملہ خوابیدہ صلاحیتیں اللہ جل شانہ کی ہی کردہ ہیں لہذا ان کی بیداری کا اسلوب وہی مناسب ہو سکتا ہے جو اس مالک ارض و سماء نے عطا فرمایا، اسی کا دیا ہوا قانون انسانی زندگی کی خوش اسلوب تشکیل میں بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے، وہ صحیفہ انقلاب قرآن ہے جس کا نزول معلم انسانیت ﷺ کے قلب مطہر پر ہوتا ہے۔ اسی کلام ربانی کو لے کر آپ نے ایک مختصر ترین عرصہ میں انسانی زندگی کا رخ پلٹ کر رکھ دیا۔ صحابہ کرام کی معطر زندگیاں اس کی بہترین مثال ہیں۔ اس اہمیت کے پیش نظر اس تحقیقی مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ ان پوشیدہ اسرار و رموز کو احاطہ تحریر میں لایا جائے جو قرآنی اسلوب زندگی کی تشکیل میں مثبت کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف شواہد اور دلائل کی روشنی میں قرآنی اور غیر قرآنی اسلوب زندگی کا تقابل بھی پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

کلیدی الفاظ: تخلیق انسانی، صلاحیتیں، مہذب، انسانی زندگی، صحیفہ انقلاب، صحابہ کرام

انسان وجود کی نعمت پا کر بہارِ آفریں دنیا میں برسوں اپنا مقسوم پانا اور اس کی بہجت و رونق میں اپنا کردار ادا کرنا معمولی بات نہیں اور احسان در احسان یہ کہ کوئی دوسرا وجود اپنی حیات و شعور کے باوصف اس انسان کی عظمتوں کے ہالے کو بھی نہ چھو سکا۔ یہ بات سب پر عیاں ہے کہ اس پیکرِ رعنائی و دلبری کا وجود اور اس کی

* چیئرمین شعبۂ علومِ اسلامیہ و عربی، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

** پی ایچ ڈی سکالر، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور

حیات، جسم و روح کے سنگم سے ہے۔ بغیر جسم کے روح انسان نہیں جب کہ بغیر روح کے جسم میّت ہے یعنی جسم و روح کا ملاپ یہی موجبِ حیات ہے۔

پھر کرم بالائے کرم، کہ اس حیات کو بقائے دوام بخشنے کے لیے سلسلۂ تناسل قائم کیا جس سے محبت و قرارِ جاں کا وہ ساماں رکھا گیا کہ گویا حیات میں بھی ایک حیات رکھ دی۔ زندگی کو تنوع عطا کیا۔ مراحل و مدارج میں تقسیم کیا اور اس کے وجود کی بقاء کے لیے جس جس شے کی جس قدر ضرورت تھی، مہیا فرمائی۔ پھر انہی ضروریات کے حصول کے لیے کد و کاوش اور زندگی کو آسان تر بنانے کے اسباب کی راہیں متعین فرما دیں۔ مگر کیا گارنٹی کہ انسان کا اُٹھنے والا قدم جانب منزل ہی ہے؟ تو ایسی بے یقینی میں زندگی کا ہر بڑا فیصلہ کرنے کے لیے کسی رہنما کی ضرورت ہے لیکن وہی رہنما اگر ہر قدم پر اس کی مشکل کشائی اور رہبری کرے، اُجرت یا عوض کا تقاضا بھی نہ کرے اور مابعد الموت کامیابی کی ضمانت بھی دے تو کوئی تیرہ بخت ہی اس رہنما سے دوری پر راضی ہوگا۔

زندگی اور اس کی حقیقت

زندگی یا حیات جو تمام افعالِ جسمانیہ کی شرطِ اوّل ہے اور دنیا میں اسی کے دم سے بہار ہے اس کی تعریف کرتے ہوئے علامہ راغب اصفہانی بیان فرماتے ہیں کہ:

''حیاۃ کے کئی معنٰی ہیں (۱) قوتِ نامیہ، (۲) قوتِ حاسّہ، (۳) قوتِ عاملۂ عاقلہ''[۱]

یعنی وہ قوت جو جسم کی بڑھوتری میں کردار ادا کرے یا وہ قوت جس سے انسان میں کسی شے کو محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا ہو ایسی قوت جو ادراک بھی عطا کرے اور افعال سرانجام دے اسے زندگی کہتے ہیں۔

حیاتیاتی زندگی میں کوئی انسان مؤمن ہو یا منکر، ان کے مابین کوئی فرق نہیں، سببِ تخلیق، شکمِ مادر میں مرحلہ وار تیاری اور تخلیق کی تکمیل میں سب انسان یکساں ہیں۔ سورۃ مومنون میں اس پورے مرحلہ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[۱]

[۱] الاصفہانی، حسین بن محمد الراغب، العلامہ، المفردات فی غریب القرآن، قدیمی کتب خانہ، کراچی، س ن، ص ۱۴۴۔

اور بتحقیق ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے بنایا۔ پھر ہم نے اسے ایک محفوظ جگہ پر نطفہ بنا دیا۔ پھر ہم نے نطفے کو لوتھڑا بنایا پھر لوتھڑے کو بوٹی کی شکل دی پھر بوٹی سے ہڈیاں بنا دیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر ہم نے اسے ایک دوسری مخلوق بنا دیا۔

ان آیاتِ مقدسہ میں ''الانسان'' یعنی پوری انسانیت کے اوّل تا آخر تمام تر حیاتیاتی تدریجی مراحل کو بیان کیا گیا ہے۔ مگر یہ مبحث حرارتِ عزیزیہ پر مشتمل زندگی کے متعلق نہیں جو محض گردشِ خون، جسمانی حرارت اور قویٰ جسمانیہ کے افعالِ ضروریہ سے تعبیر کی جاتی ہے بلکہ ہم اس زندگی سے مراد بامقصد، مطلوب و مفید، نافع اور اطاعت سے بھرپور زندگی مراد لے رہے ہیں، جس میں زندگی کے نظریہ کی بجائے، زندگی میں نظر پر بحث کی جاتی ہے اور قرآن ایسی زندگی کے متعلق کیا کہتا ہے جو مخصوص عقائد و اعمال کی جامع ہو۔ ایسی زندگی کی تقسیم کار میں قرآن نے خود جا بجا تعلیمات مہیا فرمائی ہیں جن سے ہر شخص بخوبی جان لیتا ہے کہ مقبول و کامیاب زندگی کون سی ہے اور مذموم و غیر مقبول کون سی؟ قرآن نے زندگی کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ[۲]

کہ دنیاوی زندگی صرف کھیل تماشا ہی ہے۔

اسی طرح سورۂ ملک کی ابتداء میں زندگی کی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا[۳]

کہ اُس نے زندگی اور موت کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں عمل کے اعتبار سے کون اچھا ہے؟

سورۂ عنکبوت میں اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

وَ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَھِیَ الْحَیَوَانُ١ لَوْ كَانُوْا یَعْلَمُوْنَ۶۴۰۰[۴]

ترجمہ: ''اور بلاشبہ اخروی ٹھکانہ ہی تو (اصل) زندگی ہے کاش وہ (لوگ) یہ جان لیتے۔''

---

[۱] المؤمنون، ۲۳: ۱۲- ۱۴

[۲] الانعام، ۶: ۳۲

[۳] الملک، ۶۷: ۲

[۴] العنکبوت، ۲۹: ۶۴

ان تین مختلف آیات کے اجزاء بھی ہمیں زندگی کی حقیقت سمجھنے کے لیے کافی ہیں جن میں دنیوی زندگی کو کھیل، بے کار کام اور آزمائش کہا گیا جس میں بتانا یہی مقصود ہے کہ دنیا کی زندگی ادھوری، ناتمام اور عارضی ہے، اس کی رونق، لحظات اور لمحات پر مشتمل ہے جب کہ حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

مقصدِ حیات

زندگی کیا ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ سوال جس قدر اہم اور ضروری ہے اسی قدر آج کا انسان اس کے جواب کے متعلق جہل کا شکار ہے۔ تاہم قرآن نے حیات کی مقصدیت کی طرف بھی واضح اشارات فرمائے تاکہ رسائی آسان ہو سکے۔ اللہ کریم ارشاد فرماتا ہے: لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ۝۷۹ کہ قرآن کو صرف پاک ہی چھو سکتے ہیں۔ تو جیسے قرآن کے ظاہر کو مس کرنے کے لیے ظاہر کا پاک ہونا ضروری ہے اسی طرح قرآن کے باطن اور اس کی روح تک رسائی کے لیے انسان کے باطن کا پاک ہونا بھی تو ضروری ہوا یعنی نیّت، عقل، فکر، خیال، نظریہ اور عقیدہ میں پاکیزگی ہی اس کی روح تک پہنچانے کا راستہ ہیں۔ سورۂ الذاریات میں اس مقصویت کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ[1]

کہ میں نے جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا تاکہ وہ میری عبادت کریں۔

آیتِ کریمہ کا آخری جزء لِيَعْبُدُوْنِ تخلیقِ انسانی کی مقصدیت کی طرف بین اشارہ ہے۔ علامہ خازن اسی آیتِ مقدسہ کی تشریح میں ذکر کرتے ہیں کہ:

> ''قيل معناه الا ليعرفوني وهذا حسن لانه لو لم يخلقهم، لم يعرف وجود و توحيده. و قيل معناه: الا ليخضعوا لي و يتذلوا لأن معني العبادة في اللغة التذلل و الإنقياد. و كلّ مخلوق من الجنّ و الإنس خاضع لقضآء الله متذلل للمشيئة لا يملك احدٌ لنفسه خروجا عمّا خلق له.''[2]

[1] الذاریات، ۵۱: ۵۶

[2] الخازن، علی بن محمد البغدادی، لباب التاویل فی معانی التنزیل، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۰ء، ج۴، ص۱۹۷

''﴿إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾'' کے معنٰی کے متعلق کہا گیا ہے کہ اس سے مراد اِلَّا لِيَعْرِفُوْنِ ''صرف اس لیے کہ وہ میری معرفت حاصل کرلیں'' کیا گیا ہے۔اور یہ معنٰی کرنا اس لیے اچھا ہے کہ اگر وہ انھیں پیدا ہی نہ کرتا تو وہ اس کی توحید اور اس کے وجود کو ہی نہ جانتے۔اور ایک معنٰی یہ کیا گیا ہے کہ ''صرف اس لیے کہ وہ میرے لیے عاجزی کریں اور خود کو ذلیل سمجھیں'' کیونکہ عبادت کا لغوی معنٰی یہ ہے کہ خود کو کمتر سمجھنا اور اطاعت کرنا۔اور جن وانس میں سے ہر مخلوق اللہ کے فیصلے کے سامنے سرنگوں اور اس کی مشیت کے سامنے خود کو حقیر جاننے والی ہے اور کوئی بھی اپنی ذات میں اس حیثیت کا حامل نہیں کہ جس مقصد کے لیے اُسے تخلیق کیا گیا ہے۔اس سے وہ نکل جائے۔''

ان مذکورہ بالا معانی کی روشنی میں معنٰی عبادت کریں یا اطاعت، عرفان کریں یا خود کو حقیر ترین سمجھنا، بہر حال آیتِ مقدسہ کے یہ کلمات روشن زندگی کی جانب دعوتِ فکر و عمل دے رہے ہیں۔تاہم تذلّل وانقیاد اور خضوع وعبادت کی یہ زندگی نہ صرف خداوندِ قدوس کے ساتھ بندے کے تعلق کو مضبوط اور قریب کرتی ہے بلکہ عجز انکساری اور جھکاؤ، پورے طرزِ حیات پُر اثر انداز ہوتا ہے جس سے انسان کی زندگی کا مذہبی پہلو ہی نہیں بلکہ پورے کا پورا سماجی ڈھانچہ مشیتِ ایزدی کا تابع ہو جاتا ہے۔اور اسے اسلام کا امتیاز کہیے یا اعجاز، کہ اسلام کے جس پہلو کو بھی انفرادی طور پر تھام لیا جائے، اسلام کے پورے چمنستان کی سیر ہی کا سامان ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگر ذہن میں یہ سوال اُٹھے کہ جب انسان کی تخلیق کی مقصدیت، عرفان وعبادت ہے تو دنیا و ومافیہا کی پھر کیا حیثیت ہوگی؟اس کا جواب بھی قرآن نے ایسے دلآویز پیرائے میں کیا ہے کہ زندگی، دنیا اور اس کی نعمتوں کے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کا بھید بھی بالکل عیاں ہو جاتا ہے۔ارشادِ خداوندی ہے کہ:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۱۴ [1]

''لوگوں کے لیے عورتوں، بیٹوں، سونا چاندی کے ڈھیروں، نشان زدہ گھوڑوں، چوپائیوں اور کھیتیوں کی خواہشات کی محنت کو آراستہ کر دیا گیا ہے۔یہ دنیوی زندگی کا سامان ہے اور اچھا ٹھکانہ تو اللہ ہی کے ہاں ہے۔''

[1] آل عمران، ۳: ۱۴

اس آیتِ مقدسہ میں متعدد اشیاء وافراد کے نام لے کر انھیں دنیوی زندگی کا ساز و سامان کہا گیا۔ مگر یہ حقیقت صرف انھی اشیاء پر ہی منحصر نہیں بلکہ دنیا بھر کی تمام اشیاء بھی اسی کے ضمن میں آتی ہیں۔ قرآن کی یہی تعلیم انسانی زندگی کے دو گروہوں کی نشاندہی کرتی ہیں کہ جو انہی اسباب میں گم ہو کر رہ گیا، اس کی رسائی مقصود تک نہیں بلکہ ''متاع'' تک رہی ہے اور جو اس دنیوی زندگی سے صرف اس قدر محظوظ ہوا کہ اسے ''متاع'' کی طرح سمجھا، استعمال کی، چھوڑا اور دل لگائے بغیر ''حُسْنُ الْمَاٰبِ'' کی طرف بڑھ گیا، وہ اس کی حقیقت کو پا گیا۔

پال اُربن نے اپنی کتاب ''Life's Greatest Lesson'' میں وائن ڈیوس کا ایک مقولہ ذکر کیا ہے کہ: ''کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس ہے ہم اسے بہترین انداز میں استعمال کریں، کامیابی عمل کرنے میں ہے، حاصل کرنے میں نہیں، کوشش کرنے میں ہے، فتح میں نہیں۔''[1]

یقیناً جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے اس میں سے زندگی بالاتفاق ہر نعمت سے مقدم اور سب سے بڑھ کر عطا ہے۔ بقول پال اربن اور وائن ڈیوس ''اسے بہترین انداز میں استعمال کریں'' کے ضمن میں آخر وہ کیا راہِ عمل ہوگی جس پر چل کر کوئی بھی شخص اس نعمت کے بہترین استعمال کا دعویٰ کر سکے؟ یقیناً وہ قرآن کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں ہے۔

اس کتاب میں مصنف نے ۲۰ اسباق میں اوّلین سبق کامیاب زندگی کے متعلق بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کامیاب زندگی کا دار و مدار پیسہ پر نہیں، نہ ہی پیسہ ذاتِ خود کوئی کامیابی ہے کیونکہ دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کے پاس طاقت، سماجی مقام و مرتبہ اور جائیداد ہونے کے باوجود کامیابی نہیں ہے۔ بلکہ کامیابی کا معنٰی یہ ہے کہ زندگی کے تمام چیلنجوں اور دشواریوں کو قبول کرنا، مثبت رویہ رکھنا، دوسروں کی ضرورت، جذبات و احساس کا خیال، احترامِ آدمیت، خوبیاں تلاش کرنا، اپنے اہداف کا تعلق زندگی کو عملی سانچے میں ڈھال لینا اور اپنی صلاحیتوں اور امکانات کو استعمال میں لانا ہے۔

میں اور آپ اگر انصاف پسندی سے مصنّفین کی آراء اور نگارشات کا جائزہ لیں تو چند قوانین، ضابطے اور اصولوں کی محدود سی اخلاقی وادی میں انہیں کسی مشاہداتی طاقت کے زیر اثر ان کی پابندی کرتے ہوئے پائیں گے اور بہت سی باتیں تو زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب ایک مؤمن ہی بجا طور پر دینے کی اہلیت رکھتا ہے کہ عقلِ انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں راہ کی تعیین کے لیے ناکافی ہے

---

[1] زندگی کے ۲۰ عظیم سبق، مترجم: محمد احسن بٹ، Hall Uthan, Life's Greatest Lessons، دار الشعور، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۳

کیونکہ جہاں جذبات ہوں گے وہاں عقل کا ان جذبات کے تابع ہونا ایک فطری عمل ہے۔ حتیٰ کہ معروف عقلیت پرست سائنسدان کو بھی اپنی عقلِ نارسا کا اعتراف بہر حال کرنا پڑا کہ :

''سائنس ہمیں صرف یہ بتا سکتی ہے کہ ''کیا ہے؟'' وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ ''کیا ہونا چاہیے'' اس لیے کہ اقدار کی قیمت مقرر کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ اس کے برعکس مذہب (یعنی دین) کا کام یہ ہے کہ وہ انسانی فکر و عمل کی قیمت مقرر کرے۔''[1]

اور دنیا اسلام جیسا مذہب اور قرآن جیسی کتاب لانے سے عاجز ہے جو کہ حقیقی طور پر ایک حقیقی زندگی کے داعی ہیں۔

ذیل میں ہم ابتداءً غیر قرآنی زندگی، اس کے اسباب و وجوہ اور اس کے مفاسد پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں بعد ازاں قرآنی زندگی کا اس سے امتیاز اور اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں۔

غیر قرآنی اسلوبِ حیات

اسلام، قرآن اور شریعت میں یہ اصطلاح باقاعدہ طور پر اگرچہ منقول نہیں تاہم غیر مسلموں میں بالعموم اور اہلِ اسلام میں بھی عملاً اس کی تصویر کھلے عام نظر آتی ہے۔ قرآنی اسالیب، اخلاق، نظریات و عقائد، افکار و تعلیمات سے کوسوں دور اسی کا راج ہے۔ کتب سے لے کر میڈیا تک اور فکری طور پر بھی اس کی اشاعت کے سلسلے پر نئے دن میں نت نئے انداز کے ساتھ معرضِ وجود میں آ رہے ہیں۔ گویا ایسی زندگی جس میں حقوق اللہ سے لے کر مذہبی حقوق تک اور معاشرتی اقدار سے لے کر ذاتی امور تک پر ادنیٰ و اعلیٰ اقدام میں شُترِ بے مہار کی طرح آزادانہ زندگی گزارنا اپنا حق تصور کیا جائے جہاں جھوٹ، بد خلقی، بد کرداری، ناانصافی، بدعہدی، غارت گری، خُود غرضی، اور افراط و تفریط اور ہر طرح کے رذائل سے بچنے اور بچانے کی کوئی مذہبی تعلیم موجود نہ ہو یعنی یوں کہا جائے کہ ایک بے لگام اور بے مہار زندگی کی راہ ہی غیر قرآنی اسلوبِ حیات ہے تو اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے اور قدرے تامل کرنے کے بعد آخر کار فیصلہ یہی ہوگا کہ کچھ ایسی ہی زندگی کو غیر قرآنی زندگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآنی تعلیمات سے دور رہنے والے افراد دو ہی قسم کے ہوں گے یا دونوں ہی قسم کے ہوں گے۔ اوّل وہ جو دائرۂ اسلام سے دور ہیں اور انھیں غیر مسلم ہونے کی وجہ سے قرآنی زندگی نصیب نہ ہو سکی۔ دوسرے وہ لوگ جنھیں دولتِ ایمان تو نصیب ہوئی مگر وہ اسلام کی راہوں پر چلنے کی سعادت حاصل نہ کر پائے۔ سطورِ

[1] اشفاق احمد، انسان کا مقام اور مقصدِ حیات، مثال، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۱۲۸

زیریں میں ایسے دونوں ہی طبقات کے متعلق چند اشارات ذکر کرنے کے ساتھ غیر قرآنی زندگی کے نقائص پر بحث کریں گے جن میں مقصدِ وحید یہی کارفرما ہے کہ زندگی خواہ دنیوی ہو یا اُخروی، اس کی کامیابی اسی تعلیم پر منحصر ہے جو وحی کے ذریعے بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لیے ہزاروں سال درجہ بہ درجہ ارسال کیا جاتا رہا اور بالآخر ڈیڑھ ہزار سال قبل اس کی تکمیل کا واضح اعلان کر دیا گیا۔

غیر قرآنی زندگی کے اسباب

قرآن سے دوری کے یقیناً کچھ اسباب ہی ہوا کرتے ہیں جن کی بناء پر انسان اس نور سے دور ہو جاتا ہے یا کر دیا جاتا ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ذیل میں چند اسباب کا ذکر کیا جاتا ہے:

(i) تعلیماتِ قرآنیہ سے نابلد ہونا

آج بھی دنیا میں ایسے سینکڑوں دیہی اور پسماندہ علاقے ہیں جہاں قرآن کی روشنی سے فیض یاب ہونے کے اسباب مہیا نہیں۔ مبلغین یا میڈیا کی وجہ سے وہاں قرآنی تعلیمات پہنچی ہی نہیں۔ اور یہ لمحۂ فکریہ ہے اُن مبلغین اور دینی ذمہ داران کے لیے کہ جن کی توجہ دُور نہ سہی اپنے ہی ملک میں سندھ، بلوچستان اور پنجاب کے بہت سے علاقوں کی جانب نہ ہونے کی وجہ سے یہ محرومیت پائی جاتی ہے۔ اس کے ذمہ دار کون ہونگے؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے۔

وَ لْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[1]

اور تم میں ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو نیکی کی دعوت اور بھلائی کا حکم دے اور برائیوں سے روکے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ایک گروہ پر عائد کی گئی ہے جس سے عہدہ براہونا عملی تدابیر کے بغیر ممکن نہیں۔

(ii) حصولِ دنیا

حصولِ دنیا نے انسان سے خوفِ خدا، طلبِ آخرت، فکرِ قبر، تلاوتِ قرآن اور اطاعتِ نبوی سب کچھ ہی چھین لیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے فرمانِ اعالی شان ((حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيْئَةٍ))[2] دنیا کی محبت تمام

---

[1] آل عمران، ۳: ۱۰۴

[2] البیہقی فی الحادی والسبعین من الشعب، بإسناد حسن إلی الحسن البصری

خطاؤں کی سرخیل ہے۔ میں اسی راز کو آشکار کیا گیا ہے۔ اسی حبِّ دنیا نے بندۂ مومن کے پاک دل کو ایسا گدلا کر دیا ہے کہ قرآنی تعلیمات کا ذوق ہی جاتا رہا ہے۔

(iii) لوگوں کی باتوں کا خوف

قرآن کی تعلیمات سے دوری کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اگر ہم اس پر چلے تو لوگ کیا کہیں گے؟ جہاں کسی عمل کے ارتکاب سے پہلے ہمارے دلوں میں ذلّت اُٹھانے کا ایک خوف رہتا ہے وہاں کسی عمل کو کر گزرنے کے بعد بھی بہت سی جلی کٹی باتیں سننے کے بعد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور معاشرے کے افراد کی یہ روش گویا یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ [1] (وہ اللہ کے راستے سے روکتے ہیں) کا مصداق بن جاتی ہے۔ تاہم قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس قدر مضبوطی سے اس جادۂ حق پر گامزن رہے کہ راستے میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ پاش پاش ہو جائے مگر اس کی ثابت قدمی نہ جائے۔

(iv) والدین کی بے توجہی

ہر بچے کی اوّلین درسگاہ اُس کا گھر اور اوّلین معلم اُس کے ماں باپ ہوا کرتے ہیں۔ والدین کی تعلیم و تربیت کا عکس تاحیات ذہنوں میں نقش رہتا ہے لہٰذا اگر یہی والدین بچے کی تربیت میں بے توجہی برتیں اور قرآن کی روشنی سے اسے محروم رکھیں تو آئندہ زندگی میں چونکہ اس کا منہجِ حیات متعین ہو چکا ہوتا ہے تو اس کا لوٹ کے خود قرآن کی طرف آنا خاصا مشکل امر ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے والدین کی توجہ اس ذمہ داری کی جانب مبذول فرمائی کہ:

كُلَّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَي الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدِانِهِ أو يُنَصِّرَانِهِ أو يُمَجِّسَانِهِ [2]

کہ ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت اسلامیہ پر پیدا ہوتا ہے جب کہ اُس کے ماں باپ ہی اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بناتے ہیں۔

اس فرمانِ نبوی میں والدین کی تربیت کی تاثیر کا نتیجہ بیان کر دیا گیا ہے تاکہ یہ خود اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی راہوں کا تعین کرتے ہوئے فرامینِ خداوندی اور نورِ قرآن کو فراموش نہ کر دیں۔

---

[1] الاعراف، ۷: ۴۵

[2] البخاری، محمد بن اسماعیل، الامام، الجامع الصحیح البخاری، قدیمی کتب خانہ، کراچی، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین، ج ۱، ص ۱۸۵

(v) قرآن کو مشکل سمجھنا

قرآن اور اس کی تعلیمات سے دور رہنے والے افراد کی ایک بہت بڑی تعداد صرف قرآن کو مشکل سمجھنے یا قرآنی راہوں کو اپنانا مشکل ہونے کی وجہ سے اس سے کنارہ کش ہو چکے ہیں۔ یقیناً مغربی پراپیگنڈہ نے آج کے دورِ جدید میں قرآن کے متعلق قدامت قدامت کی رٹ لگا کر اہلِ ایمان کے دلوں میں رخنہ ڈال ہی دیا ہے لیکن قرآن پر عمل پیرا ہونے والا اس حقیقت سے آشنا ہے کہ:

وَ لَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ۱۷ [1]

ترجمہ: ''اور ہم نے سمجھنے کے لیے قرآن کو آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرنے والا ہو؟''

اس آیتِ کریمہ کے دوسرے جزو میں جس دلآویز انداز میں دعوت دی گئی ہے وہ اس راہ پر چلنے والوں کو جذبۂ شوق بھی دے رہی ہے اور آگے بڑھنے والوں کے لیے ایک پوشیدہ انعام کا شعور بھی۔

(vi) عہدِ حاضر کی خرافات

کفر روزِ اوّل سے حق کے ساتھ بر سرِ پیکار رہا ہے۔ دورِ حاضر میں اس نے اہلِ اسلام کے دلوں میں انٹرنیٹ، سوشل، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے راستے سے اسلامی قدروں پر حملہ کیا ہے جس سے شعوری اور لاشعوری طور پر ہر فرد ہی متاثر ہوا ہے۔ بقیہ ایام کا تو کیا کہنا رمضان المبارک میں بھی عبادات و یکسوئی کا جذبہ پامال کر دیا ہے۔ ایک سروے کے مطابق یہ رجحان محتاط اندازے کے مطابق ۶۰ فیصد جب کہ مطالعۂ کتب کا رجحان فقط ۱۹ فیصد رہ گیا ہے۔ اس ۱۹ فیصد کے ضمن میں تمام مضامین کی کتب شامل ہیں تو قرآن کی تلاوت کا گراف کس قدر نیچے آگیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ علاوہ ازیں قومی پشت پناہی کے ساتھ کھیلنے جانے والے کھیل، پرائمری اداروں سے یونیورسٹیز تک مخلوط تعلیم، تعلیمی اداروں میں پڑھائے جانے والے مغربی تہذیب سے معمور مضامین، بے پردگی کے بڑھتے ہوئے رجحانات، مذہب اور دنیا کو دو الگ الگ حیثیتوں سے دیکھا جانا قرآنی حیات سے دوری کے اسباب ہیں۔

(vii) غربت و افلاس

علوم قرآن کو اگرچہ پھیلانے اور سینے سے لگانے والا طبقہ مفلوک الحال طبقہ ہی ہے تاہم مجموعی طور پر غربت، افلاس، مہنگائی، بنیادی ضروریات اور فقر و فاقہ نے انسان سے حلال و حرام، جائز و ناجائز، خیر و شرّ کی

[1] القمر، ۵۴: ۱۷

تمیز چھین لی ہے۔یہی طبقہ بالخصوص تحصیلِ علم سے محروم اور تعلیمی اداروں سے دُور نظر آتا ہے۔بنیادی ضروریات نے کمائی کے سائیکلون کا حصہ بنادیا ہے جس کا نتیجہ وہی خدشہ نکلا جو آنحضور ﷺ نے بیان فرمایا کہ :

((كَادَ الْفَقْرُ أَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا))[1]

کہ قریب ہے کہ محتاجی کفر بن جائے۔

آج جس معاشرے میں روٹی کے عوض، عزّت نیلام ہو رہی ہو، باپ اپنی اولاد سرِ بازار بیچ رہا ہو اور مسلمان ہونے کے باوجود پاسپورٹ پہ خود کو غیر مسلم لکھوا کر ویزہ حاصل کیا جارہا ہو، وہاں کیا غربت وافلاس قرآنی زندگی اختیار کرنے سے مانع نہ ہوگی؟ یقیناً غربت وافلاس نے بھی ذریّتِ آدم کو راہِ حق کا مسافر بننے سے روک رکھا ہے۔

(viii) بے جامحبت کی کثرت

محنت جب تک ایک دائرے میں محدود ہو کر رہے انسان اس محبت سے متمتع ہوتا رہتا ہے لیکن جب یہ محبت انسان کو اندھا بنادے اور اپنی حدّ سے باہر نکل جائے تو وبالِ جان بن جایا کرتی ہے۔اسی بے جامحبت سے قرآن نے اس طرح منع فرمایا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَ لَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾[2]

کہ اے ایمان والو! تمھیں تمہاری اولاد اور تمہارے مال اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ مال اور اولاد اللہ سے دُوری کا سبب بنتے ہیں اور جو چیز انسان میں خود فراموشی اور خدا فراموشی پیدا کردے وہ بھلا انسان کو پوری زندگی اسی نہج پر گزارنے کی کیونکر اجازت دے گی؟

غیر قرآنی زندگی کے داعی مذاہب پر ایک نظر

مذکورہ بالا مبحث میں اہلِ اسلام ہی کی جانب سے پیش آمدہ رکاوٹوں کا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کے ضمن میں یہ بات بھی ذکر ہوئی کہ قرآن، اسلام اور سیرتِ نبوی ﷺ سے دور کرنے میں کم و بیش تمام اسباب بالواسطہ یا بلاواسطہ غیر مسلم فکر کے مرہونِ منت ہیں۔جب کہ تمام مذاہبِ عالم اپنی تعلیمات میں مذہبِ اسلام کی کسی جزء تک بھی نہیں پہنچ پاتے، چہ جائیکہ وہ عملی میدان میں اسلام کے ساتھ مقابلہ کرپائیں۔

---

[1] البیہقی، احمد بن حسین ابو بکر، الامام، شعب الایمان، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۳ء، ج۱، ص۴۸۶

[2] المنافقون، ٦٣: ٩

ذیل میں مختصراً دنیا کے بڑے مذاہب کی تعلیمات اور عملی کردار پر چند سطور ذکر کرنے کے ساتھ یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تاریخی اور مشاہداتی اعتبار سے بھی ایک قرآنی زندگی ہی آئیڈیل اور محمود زندگی ہے، اگرچہ اسے اپنانے والے افراد معدودے ہی کیوں نہ ہوں۔

(i) عیسائیت

پوری دنیا میں آبادی کے اعتبار سے سب سے بڑا مذاہب عیسائیت ہے جو تقریباً دنیا کی آبادی کا ۳۳ فیصد ہیں۔ عملی اعتبار سے جس قدر یہ اپنے مذہب سے دور ہو چکے ہیں اس اعتبار سے یہ عیسائی کم اور بے دین زیادہ ہو چکے ہیں۔ اور اپنی تحریفات کی لپیٹ سے دین کو ایک گورکھ دھندہ بنا رکھا ہے۔ اگر بالفرض موجودہ اناجیل کی تعلیمات کو درست تسلیم کر بھی لیا جائے تو پھر بھی تمام گوشہ ہائے حیات میں اس کی رہنمائی کا دائرۂ تعلیم انتہائی محدود ہے۔ سیّد امیر علی اس کے متعلق یوں تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرت عیسیٰ کی تبلیغ کا بے وقت رُک جانا اس دین کو مستقبل کے لیے کوئی ترکیبی نظامِ تعلیمات فراہم نہ کر سکا۔ اس سے حضرت عیسیٰ کی اپنی حیات اور فطرت کے بارے میں بھی کئی نزاعی پہلو سامنے آنے لگے۔ دیگر واقعات یہودیوں اور عیسائیوں کا یروشلم سے خروج، عیسائیوں اور یہودیوں کا باہمی اختلاط، نو فیثا غورثی اور افلاطونی افکار و خیالات وغیرہ نے حضرت عیسیٰ کے تصوّر کو لوگوں میں اور بھی مبہم اور دھندلا کر دیا تھا۔ یوں ایک سماوی پیغمبر کا وجود ان لوگوں کے لیے محض ایک معمولی اوتار کا درجہ اختیار کر گیا تھا۔''[1]

لہٰذا جہاں پیغمبر کی زندگی ہی ابہام کا شکار ہو وہاں ان کے دیے گئے مذہب کے متعلق شکوک و شبہات کا ذہن میں پیدا ہونا بدیہی امر ہے چنانچہ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی لکھتے ہیں:

> ''عیسائیت چونکہ فطرتِ واقعیہ کے تقاضوں کی نفی کرتی ہے اس لیے عصرِ حاضر کا انسان عیسائیت کے خلاف بغاوت کرتا ہے اور ہیومن ازم اور سیکولرزم کو سراہتا ہے۔''[2]

---

[1] امیر علی، سیّد، ڈاکٹر، روحِ اسلام، مترجم: محمد علی چراغ، نذیر پبلشرز، لاہور، س ن، ص ۱۴۱

[2] فاروقی، برہان احمد، ڈاکٹر، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۴۳

یہ دنیا کے سب سے بڑے مذہب کی مذہبی اقدار کا عالم ہے کہ مذہب فقط نام اور نسبت قائم کرنے کی حد تک رہ گیا اور اسی دین کے نام لیوا سیکولر ہو رہے ہیں۔ بقیہ مذاہب عالم کا کیا ہو گا؟ یہ ذیل کی سطور میں بیان کیا جاتا ہے۔

(ii) ہندومت

دنیا کا تیسرا بڑا مذہب ہندومت ہے جس کی زیادہ تر آبادی انڈیا اور نیپال میں ہے۔ اس مذہب کی تعلیمات افسانوی اور عملی کردار غیر عقلی ہے اگرچہ ہزاروں برسوں سے یہ مذہب قائم ہے تاہم انہی کے مذہب میں موجود اپنے ہی مذہب سے بیزار لوگ بھی صدیوں سے عقلاً اس مذہب کے مخالف رہے ہیں۔

''ہندومت کا تعلق زندگی کے امور سے زیادہ اور عقائد سے کم۔ پھر اس کے لیے محدود حدود والی عبادتیں بھی نہیں ہیں اس لیے یہ عقائد میں اس چیز کو بھی شامل ہے جو درختوں، پتھروں، بندروں، چراگاہوں، شرم گاہوں، گائیوں بلکہ ہر چیز کی عبادت کی حدّ تک نیچے گرادیتی ہے۔''[1]

وہ عقیدہ جس پر پورے مذہب کی بنیاد رکھی جاتی ہے اس کی کمزوری کا عالم جب یہ ہو تو یہ اُس مذہبِ برحق جو فقط خدائے واحد و یکتا کو ماننے والا ہو، کیونکر مقابل، مساوی یا برتر ہو سکتا ہے نیز ہندو مذہب میں عدمِ مساوات، معاشرتی درجہ بندیاں اور عدمِ رواداری آج کے دور میں بھی معاشرتی جہالت کی بہت بڑی مثال ہے۔ سیّد امیر علی اس طبقاتی تقسیم کا یوں ذکر کرتے ہیں:

> ''کسی شودر کو یہ اجازت ہرگز نہیں کہ وہ مذہبی گدّی بردار کسی برہمن سے ویدوں کے کلام کو سُن سکے۔ اگر کوئی شودر غلطی سے ویدوں کا کلام سُن لیتا تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔ اسی طرح کسی شودر کو یہ بھی زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ براہمن کے برابر بیٹھ سکے۔''[2]

معاشرے کی اس درجہ بندی اور طبقاتی تقسیم نے انسان کو انسانیت کے گراف سے جس طرح گرادیا تھا، ایسے میں اسلام ان گرے ہوؤں کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

اس مظلوم گروہ کی مظلومیت اور درد کی کہانی ایسی سنگین رہی ہے کہ آج کے دور میں ہندو مذہب کو ایک مہذب مذہب یا ترقی یافتہ قوم کہنا خُود کہنے والے کے مہذب ہونے کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ دنیائے

---

[1] شیبۃ الحمد، عبد القادر، الادیان والفرق والمذاہب المعاصرۃ، مترجم: ابو عبداللہ محمد شعیب، اقوامِ عالم کے ادیان و مذاہب، مسلم پبلی کیشنز، گوجرانوالہ، ۲۰۰۷ء، ص ۸۱- ۸۲۔

[2] روحِ اسلام، ص ۲۳

عرب کے اسلامی سکالر عبدالقادر شیبۃ الحمد اپنی معروف تصنیف میں اس محرومیت کے شکار طبقہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"جب وہ اپنے سے اونچے طبقہ کے آدمی پر اپنا ہاتھ یا لاٹھی اٹھائے تو اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں اور جب وہ اسے اپنے پاؤں سے ٹھوکر مار دے تو اس کا پاؤں کاٹ دیا جائے اور جب وہ اس کے نام یا اس کی جماعت کے نام سے کسی تعظیمی لقب کے بغیر اسے آواز دے تو تین دھاریوں والا گرم کیا ہوا خنجر اس کے منہ میں ڈالا جائے جس کی لمبائی دس انگشت ہو جائے اور بادشاہ اس کے منہ اور کانوں میں گرم تیل ڈالنے کا حکم دے گا، جب وہ بے شرمی کے اس مقام تک جا پہنچے کہ وہ برہمنوں کے سامنے ان کی ذمہ داریوں کے معاملات میں کسی رائے کا اظہار کر سکے۔"[1]

سوچیئے! کہ جس مذہب میں جانوروں اور شرم گاہوں کو معبود سمجھا جائے، نسلی تفاخر کو بزورِ شمشیر لاگو کیا جائے، غربت زدہ اور چھوٹے قبائل کے افراد کو اچھوت تصوّر کیا جاتا ہو، مذہبی کتاب پر صرف اور صرف ایک طبقہ کی اجارہ داری قائم ہو اور تمام معاشرتی رویوں میں چاروں طبقات کے لحاظ سے عہدے، رزق اور عزّت میسر آتی ہو، کیا ایسا مذہب قابلِ اقتداء اور لائقِ تقلید ہو گا؟ کیا ایسے مذہب میں مساوات، رواداری، عدل، اخوّت، ہمدردی، احترامِ انسانیت اور دیگر اخلاقی قدروں کی کوئی جگہ ہو گی؟ یقیناً کسی مہذب فردِ معاشرہ کے لیے اور بالخصوص ایک بندۂ مومن کے لیے اس مذہب میں جاذبیت ۰ فیصد کہنا بھی انتہائی احتیاط سے کام لینے والی بات ہے۔

(iii) بدھ مت

یہ دنیا کا چوتھا بڑا مذہب ہے جس کی آبادی دنیا میں تقریباً پچاس کروڑ کے قریب ہے۔ اخلاقیات کی تعلیم اس مذہب کی خاصیت سمجھی جاتی ہے تاہم عقائد کے حوالے سے بدھ مت کا دامن بالکل خالی ہے۔ اس حوالے سے پیر محمد کرم شاہ الازہری لکھتے ہیں:

"صحیح بات یہ ہے کہ نہ وہ خدا کے وجود پر ایمان لانے کو ضروری سمجھتے تھے اور نہ ہی کسی کو خدا نہ ماننے کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا تعلق لَاادْرِیُ فرقہ سے تھا جن سے جو بات پوچھی جائے ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ میں نہیں جانتا۔"[2]

---

[1] اقوامِ عالم کے ادیان و مذاہب، ص ۹۱

[2] الازہری، محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۸ھ، ج ۱، ص ۲۱۳

اندازہ کیجیے! یہ بدھ مت مذہب کے بانی گوتم بدھ کے علم کا عالم ہے کہ ہر سوال کے جواب میں ''میں نہیں جانتا'' کا جواب دے کر خلاصی پالیتا۔ دوسری بات یہ کہ جس مذہب میں خدا کا تصوّر سرے سے ہی موجود نہ ہو، اس دین یا مذہب میں کس قدر پختگی اور سچائی ہوگی، یہ بات اہلِ عقل پر مخفی نہیں۔

بدھ مت کے بانی گوتم بدھ نے اپنی زندگی میں جو انقلاب برپا کیا، پیر صاحب اس کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ:

'' (i) اس نے ویدک دیوتاؤں کو ختم کر دیا۔

(ii) قربانی ممنوع کر دی۔

(iii) ذات پات کے امتیازات کو ختم کر دیا۔

(iv) برہمنوں کی مذہبی بالادستی کو خاک میں ملا دیا۔

(v) سنسکرت کے بجائے عوام کو ان کی مادری زبانوں میں تعلیم دینا شروع کی۔''[1]

ان تمام امور میں دوسرے جزء کے سوا اگرچہ تمام اقدامات، تعلیمات اور انقلابات عمدہ اور قابلِ تحسین تھے، لیکن اسے ایک مذہب کی بنیاد قرار دینا، قرینِ عقل نہیں۔ کیونکہ زندگی محض چند اخلاقی قدروں کو اپنا لینے ہی کا نام نہیں بلکہ اسے پُر بہار زندگی کے ایک جزء کی حیثیت ضرور کہا جا سکتا ہے، کامل مذہب نہیں۔ دنیا کے جس چوتھے بڑے مذہب کے پاس ہماری پوری زندگی کے لیے اخلاقی مجموعے کے سوا کچھ نہیں، آیا اسے اپنی پوری زندگی کے تمام پہلوؤں کے لیے، مذہبی، سیاسی، سماجی، علمی، تربیتی، معاشی، تہذیبی، ثقافتی، عائلی اور انفرادی معاملات کے لیے کافی و وافی سمجھا جا سکتا ہے۔

اسی طرح زرتشت کے ہاں خیر و شرّ کے دو خداؤں کا تصوّر پایا جاتا ہے۔ جین مت کے نزدیک دعائیں اور پوجا پاٹ سب بے سُود ہیں اور بدن کے سارے تقاضوں کو نظر انداز کرنا ہی انسانیت کی معراج ہے۔

یہ تھے چند غیر قرآنی اسلوبِ حیات کے داعی دنیا کے بڑے بڑے مذاہب جن کا دامن کہیں تصورِ خدا سے خالی، تو کہیں محض اخلاقیات کا پرچار، جنھیں کوئی بھی صاحبِ عقل و شعور زندگی کی ابتداء تا انتہاء اپنانے کے لیے انتہائی ناکافی جانے گا۔ اور پھر جب یہ تہی دامن مذاہبِ عالم، اسلام کے مقابل آکھڑے ہوں تو قرآن نے انسان کی تخلیق سے، مرنے کے بعد تک کے امور کو بالتفصیل رہنمائی کے انداز میں ایسے لاجواب منطقی طریقے سے بیان کر دیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم تعصب کی عینک اُتار کے اس کی جانب متوجہ ہو تو یہ سائنسی دنیا کے عجائبات تک اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔

---

[1] ایضاً، ص ۲۱۲

غیر قرآنی زندگی کے مفاسد

زندگی جو ایک پُر بہار اور دلشاد نعمت ہے، اگر قرآنی اور نبوی تعلیمات سے عاری ہو تو اگرچہ انسان اپنی عقلِ ناپائیدار سے اس کے چند زاویے سنوار ہی لے، حقیقت میں ناقص، غیر تامّ اور مفاسد سے بھرپور ہو گی۔ یہ ایک جذبات کی رو میں بہہ کر کی جانے والی بات نہیں بلکہ اس دائروی دنیا کی مسلم حقیقت ہے۔ ایسی بے مہار زندگی کے چند مفاسد اس لیے ذکر کیے جاتے ہیں کہ ایک مسلمان کے لیے قرآن کی بتائی ہوئی زندگی کی طرف سفر کرنا آسان ہو جائے۔

(i) دین سے دُوری

غیر قرآنی اسلوبِ حیات کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دین اور مذہب سے کٹ کے رہ جاتا ہے۔ اُس کے ربّ کی منشاء اور بعثتِ انبیاء کی مقصدیت کیا تھی؟ انسان اس سے یکسر دور ہو جاتا ہے جس سے معاشرے کے افراد لادینیت کی طرف نکل جاتے ہیں اور نتیجتاً اپنے اسلاف کی اقدار اور روحِ اسلام سے کُلّی طور پر بہک جاتے ہیں۔ ایک مسلم اور غیر مسلم کے درمیان پیغامِ قرآن پر لبیک کہنا ہی تو حدِّ فاصل ہے اگر یہی ختم ہو جائے تو مسلم و کافر کے مابین کیا فرق رہ جائے گا؟

(ii) اخلاقی بے راہ روی

اخلاقِ کریمانہ کی جو بلندی اور احترام انسانیت کے نام پر جو وقار اور عظمتِ قرآن نے تعلیم دی ہے جین مت اور بدھ مت کی تعلیمات بھی اس کے سامنے بے مایہ نظر آتے ہیں، لیکن جب زندگی کو ان تعلیمات سے آراستہ و پیراستہ نہ کیا جائے تو معاشرے میں ایسی اخلاقی بے راہ روی پھیل جاتی ہے جسے خود اس قرآن کے بغیر روکنا ممکن ہی نہیں۔ خود غرضی، مفاد پرستی، لالچ، حرص و ہوا اور نفسانی خواہشات کا ایک طوفان ہے جو معاشرے کے امن و سلامتی پر ایسی کاری ضرب ثابت ہوتا ہے کہ تمام تر اخلاقی جرأتیں جس کے سامنے ڈھیر ہو جاتی ہیں۔

(iii) خانگی اور خاندانی معاملات کا بگاڑ

انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، اپنے ماں باپ، بیوی بچوں، ننھیال، ددھیال اور سسرال کے پاکیزہ اور مخلص رشتوں میں مربوط ہے۔ دیگر افرادِ معاشرہ کے ساتھ تو بگاڑ کے بھی وقت گزر ہی جاتا ہے لیکن ان تعلقات کے ساتھ جذبات کے بگاڑ کی صورت میں وقت گزارنا مشکل ہونے کے ساتھ ساتھ ذلّت آمیز بھی ہے۔ ایسی صورت میں ان کے حقوق، فرائض، ذمہ داریاں، لین دین، ملنساری، خوشی غمی میں شراکت زندگی کا اہم ترین پہلو ہے۔ آیا کوئی مذہب یا محض عقل تمام زاویوں سے اس کا حل پیش کرنے کا دعویٰ کر سکتا

ہے؟ گھریلو خانگی زندگی، رشتہ داروں کے ساتھ معاملات و تعلقات کے متعلق کوئی رہنمائی ہوگی؟ یقیناً جو کچھ بھی پیش کیا جائے وہ اگرچہ ایک خاندان، ایک علاقہ یا کسی خاص وقت کے لیے موزوں ہو سکتا ہے مگر ہر فطرت، ہر زمان اور ہر مکان کے تمام تر افراد کے لیے بیک وقت جو تعلیمات کامل رہنمائی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں وہ فقط قرآنی تعلیمات ہی ہو سکتی ہیں۔

(iv) والدین کی نافرمانی

حقوق و فرائض کے باب میں آج کے دور کا بہت بڑا مسئلہ اولاد میں والدین کی طرف سے بے ہدایتی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے، غور کیا جائے تو قرآنی طرزِ حیات سے دوری کی بناء پر ہی ہے، جس نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اُف تک نہ کرنے، محبت بھرے لہجے میں بات کرنے، اُن کے سامنے عاجزی کے پَر جھکا دینے کے احکامات سُننے تک نہ ہوں اُن سے اگر والدین کا بڑھاپے کا سہارا بننے، کڑوی کسیلی سُننے، فرمانبرداری کرنے اور احکام بجا لانے کا تقاضا کریں تو ماسوائے نادانی کے کچھ نہیں۔ مغربی معاشرے میں اولاد کا اپنے والدین کی نگرانی اور گرفت سے بچنا درحقیقت بچنا نہیں بلکہ اندھیرے کنویں میں گرنے کے مترادف ہے۔ ایسی اولاد جس کی تربیت کا منہج قرآن نہ ہو، اُس سے والدین کی اطاعت گزاری کی امید رکھنا عبث ہے۔

(v) معاشرتی ناہمواری

قرآن کے اسالیبِ حیات سازی سے دوری کی وجہ سے اسلامی معاشرہ ناہمواریوں کا شکار ہے۔ غربت و امارت دو حدّیں ہیں جن کے فاصلے زکوٰۃ و صدقات کے حکمِ قرآنی پر عمل پیرا نہ ہونے کی وجہ سے ناہمواری کا باعث ہیں۔ نسلی، علاقائی، لسانی، خاندانی اور مسلکی اعتبار سے ناہمواری، پیشے اختیار کرنے کے اعتبار سے اونچ نیچ، رنگ اور تعلیم کے اعتبار سے اونچ نیچ ایسی ناہمواریاں ہیں جن کے سدِّباب کے لیے قرآن ڈیڑھ ہزار سال سے اپنے پیغام کو عام کر رہا ہے مگر ان پر عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے معاشرہ طبقات در طبقات اور تقسیم در تقسیم کا شکار ہے۔ بعض امور میں یہ شگاف اندازی مختلف طبقات میں بغاوت کو جنم دیتی ہے جس سے یقیناً معاشرتی امن و سلامتی، انتقام، غنڈہ گردی اور غارت گری میں بدل جاتے ہیں۔

غیر قرآنی طرزِ حیات کے اسباب، دواعی اور اس کے مفاسد کا جائزہ لینے کے بعد، اب ہم قرآنی زندگی کے محاسن و امتیازات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہیں تاکہ اس موازنہ کے بعد قرآنی اسلوبِ حیات کی جانب توجہ کرنا فائدہ بخش ثابت ہو سکے۔

قرآنی طرزِ حیات ہی کیوں؟

سائنسی ترقی کے اس دور میں ہر تعلیم یافتہ شخص کے ذہن میں کبھی نہ کبھی یہ سوال اُٹھتا ہے کہ آخر قرآنی طرزِ حیات ہی کیوں اپنائی جائے؟ یا ترقی یافتہ سائنسی دور میں قرآنی تعلیمات کی بھلا کیا ضرورت؟ اس کا جواب جتنا اہم ہے اتنا آسان بھی ہے اور قرآن ہی کی رو سے منطقی بھی ہے اور نقلی بھی۔ یہاں میں یال اربن کی کتاب کا ایک اقتباس پیش کر کے اس کا منطقی اور عقلی جواب پیش کروں گا جب کہ منقول دلائل آئندہ صفحات میں اسی جواب کی طرف اشارہ کرتے چلیں گے۔ مصنف مذہب کی ضرورت کا شدت سے احساس دلاتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''جسم اور ذہن کو سمجھنا آسان ہے لیکن روح کو سمجھنا آسان نہیں۔ روح کو سمجھنے کا وسیلہ مذہب ہے۔ چنانچہ تمہارا مذہب کوئی بھی ہو اس کے بنیادی اصولوں پر عمل کرنے کی عادت اپناؤ۔''[1]

اس اقتباس سے راقم نے روح کو عقلِ انسانی کے حیطۂ ادراک سے ماوراء قرار دیا ہے اور اس بات میں واقعتاً صداقت بھی ہے اس کے ساتھ ساتھ اُن میں روح کا ادراک تو تب ہو جب روحانیت کا کوئی تصوّر اُن میں پایا جاتا ہو ان کے ہاں روحانی زندگی، روحانی علوم اور وجودِ روحانیت محض قولی حدّ تک ہی محدود ہے، علمی و عملی اعتبار سے وہ اس میں صفر ہیں۔

اس کے علاوہ قرآنی زندگی ہی ہے جس میں اپنے، پرائے، اکابر، اصاغر، قربت دار، ہمسائے، یتیم، بیوہ اور حاجت مند ہر ایک کے لیے مخصوص حقوق کا بیان ہے، ذمہ داریوں کا تعین ہے نیز عفو و حلم، خوش خلقی، تواضع، ایثار، میانہ روی، شجاعت، خودداری، استقامت، حق گوئی، پاکبازی، دیانت داری کے ساتھ ساتھ قلبی طور پر اپنے خالق اور خالق کے عظمت نشان انبیاء و رسل کے ساتھ تعظیم و ادب سے سرشار فکری، مذہبی اور نظریاتی پختہ تعلق قائم رکھنا اور اس کے نتیجہ میں حشر، آخرت، ملائکہ، کتب، تقدیر، جزا و سزا اور جنت و جہنم کے وجود پر پختہ یقین رکھنا اس قرآنی زندگی کے لازمی پہلو ہیں۔ ان نظریات و عقائد کے ذریعے صرف اخلاقی تعلیم دینے والے مذاہب اور اسلام کے درمیان خطوطِ امتیاز قائم ہو گئے۔ مزید برآں اس حُسنِ عقیدت کا حسین اظہار تقویٰ، ورع، صوم و صلوٰۃ، سفرِ حج اور ادائیگیِ زکوٰۃ کی صورت میں پورے عالم اسلام میں معروف و معمول ہے۔

---

[1] زندگی کے ۲۰ عظیم سبق، ص ۱۹۷

قرآنی زندگی کی طرف ہمارا رجوع اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ مقصدیت تخلیق کو پانے کے لیے دو چیزیں ہی ہمارے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہیں: یا تو انسان خود اپنے ذہنِ رسا سے واقفیت حاصل کر لے یا پھر اُسی ایک ذات کی طرف رجوع کرے جو خُود اس کی اور اس جیسی تمام انسانیت کی خالق بھی ہے اور معلم بھی۔ تو عقل کے گھوڑے دوڑانے سے تمام فیصلے یا تجربات سطحی، وقتی، غیر مستقل اور احتمال ہوں گے جب کہ خالق کی طرف رجوع کرنے سے جو رہنمائی حاصل ہو گی وہ مستقل، دائمی، غیر احتمالی اور یقینی ہو گی اور یہ تمام تر تعلیمات اُس کی آخری کتاب قرآن کے علاوہ کسی اور کتاب میں پایا جانا ناممکن ہے۔ یہ کتاب دستورِ حیات بھی ہے اور منبع رشد و ہدایت بھی مگر اس کی طرف وہی بڑھ سکتا ہے جس کے سینے میں حق کو قبول کرنے والا دل ہو و گرنہ نزولِ وحی اور مہبطِ وحی کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھنے والا ابو جہل اور امیہ بن خلف بھی تو محروم ہی رہے ہیں۔

قرآن کی عالمگیریت اور اسلوبِ تعلیم

قرآن کے پیغام کا آفاقی، دائمی اور عالمگیر ہونا اس کی جاذبیت اور اپنائیت کا سبب بنتا ہے۔ ایک طرف اس نے اسلاف کے دین حنیف کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور دوسری جانب عہدِ رواں کی سائنسی ترقی میں ان گنت معلومات کا ایک بھرپور خزینہ ہے پھر اس سے فیض یاب ہونے والا کوئی ایک مخصوص طبقہ اور گروہ نہیں بلکہ جابجا ﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ﴾ کی دلنواز صدائیں ہر طبقہٴ انسانی کو نوازنے کے لیے ہمہ تن آمادہ ہیں۔ اس کی تعلیمات انسان کی فطرتِ سلیمہ سے ہم آہنگ ہیں، یہ وحدت کا داعی ہے اس کا اسلوبِ تعلیم ناصحانہ، منطقیانہ، مؤثرانہ اور جداگانہ ہے۔ اس کا اسلوبِ بیان دلنشیں اور دلربا انداز میں دل میں اُترنے والا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر نائیک لکھتے ہیں کہ:

> ''قرآن مجید بھی لوگوں کے بارے میں ان کی عائلی زندگی اور ان کے باہمی مراسم وغیرہ کے بارے میں لب کشا ہوتا ہے مگر انداز جداگانہ ہے، نرالا ہے، انوکھا ہے۔ قرآن کا اسلوبِ بیان کسی خاص ترتیب یا نظم و ضبط کا پابند نہیں ہونے پایا، عام قصے کہانیوں کا سا اندازِ بیان تو یکسر مفقود ہے۔ قرآن کا پیام بھی دلنشیں اور انداز بھی دلربا ہے۔''[1]

[1] نائیک، محمد ذاکر عبدالکریم، ڈاکٹر، قرآن پاک افسانہ یا سچی ولٰ، مترجم: زاہد کلیم، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۳

قرآن کے اسلوبِ بیان، دلنشیں انداز، افہام و تفہیم اور تعلیم کے سادہ طریقوں نے پورے عالم کفر میں اسلام کے حق میں ایک ایسی انگیخت پیدا کر دی ہے کہ امریکہ کے تھنک ٹینک کی پیشین گوئی کے مطابق:

> ''امکان ہے کہ یورپ کی مجموعی آبادی میں اسی صدی کے وسط تک مسلمانوں کی شرح 7.4 فیصد ہو گی۔''[1]

اسی طرح نیویارک کے صباح نیوز میں امریکہ کے اندر روز افزوں اسلام کی جانب بڑھتے ہوئے افراد کے متعلق ایک اندازہ بیان کیا گیا ہے کہ:

> ''۲۰۱۷ء میں امریکہ میں بسنے والے مسلمانوں کی تعداد ساڑھے ۳۴لاکھ تھی جو کہ بڑھ ۲۰۵۰ء میں ۸۱لاکھ ہو جائے گی اور اسی عرصہ کے دوران مسلمانوں کی تعداد یہودیوں سے بڑھ جائے گی اور وہ عیسائیوں کے بعد دوسرا بڑا مذہبی گروپ بن جائے گا۔''[2]

ان ممالک میں اسلام کی طرف بڑھتا ہوا یہ رجحان قرآن کی مؤثر تعلیمات، سیرتِ نبوی اور اچھے مسلمانوں کے مثبت کردار کے سبب سے ہے۔ سیرت کی کتاب ضیاء النبی میں مصنف کتاب نے پندرہ نو مسلم افراد کے اسلام قبول کرنے کے واقعات نقل کیے ہیں جن میں سے اکثر و بیشتر افراد قرآن کی تعلیمات یا سیرتِ نبویہ کی حقانیت اور دلآویز اسلوبِ تعلیم کی وجہ سے مسلمان ہوئے۔

قرآنی زندگی کے امتیازات

جس اسلوبِ حیات کا مقتدا قرآن ہو، وہ بلاشبہ حقوق الٰہیہ کی ادائیگی سے اخلاقیات تک تمام تر گوشوں میں کامل اور مطمئن ہوتی ہے۔ عبادات کے روشن پہلو میں تو کسی مذہب سماوی یا غیر سماوی کو ذرّہ بھر بھی مماثلت حاصل نہیں، البتہ اخلاقی تعلیمات میں سے کم و بیش تمام مذاہب اور اقوام کا خاصا گہرا رجحان ہے ہم اگر تمام تر عبادات و دیگر احکام کے مبارک گوشوں سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے صرف اخلاقیات کے باب کا دیگر اقوام و مذہب کی اخلاقی تعلیمات سے موازنہ کر کے دیکھیں تو اسلام کا طرّہ یہاں بھی ممتاز اور اعلیٰ ہی نظر آئے گا کیونکہ بہت سے اخلاقی ذائل جو غیر مسلم معاشرہ یا غیر قرآنی میں شاید اخلاقیات کے بھی منافی نہیں سمجھے جاتے جب کہ اسلام نے انھیں فقط اخلاقیات کے باب میں نہیں رکھا بلکہ انھیں اخلاقی قدروں سے اُٹھا

---

[1] DW/30-11-2017، یورپ میں مسلمانوں کی تعداد www.dw.com

[2] http://ww.nawaiwaqt.com.pk > 13-Jan-2018

کر مذہبیت کے درجہ میں لا کر سخت حرام قرار دیا ہے اس کے علاوہ بہت سے اخلاقی پہلو قرآنی طرزِ حیات میں ایسے ہیں جن کی غیر مسلم معاشرے کو ہوا تک بھی نہیں پہنچی۔

ذیل میں ہم قرآنی اسلوبِ حیات کے چند امتیازات کو ذکر کرتے ہیں:

(i) رزق کی ذمہ داری

قرآنی طرزِ زندگی میں مغربی و غیر مسلم معاشرے کی طرح صبح و شام صرف رزق کی تلاش ہی نہیں بلکہ دیگر بہت سی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا بھی لازم ہے۔ رزق کی ذمہ داری اللہ رب العزت نے خود اپنے ذمہ کرم پر لی۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا[1]

یعنی: کوئی چوپایہ روئے زمین پر نہیں مگر اس کا رزق اللہ ہی کے ذمہ (کرم) پر ہے۔

اسی طرح سورۂ انعام میں ﴿نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ﴾[2] (ہم تمہیں اور اُن کو بھی رزق عطا کرتے ہیں) کے کلمات اسی امتیازی وصف کی ترجمانی اور وضاحت کر رہے ہیں لہٰذا ایسا شخص جو اکتسابِ رزق اور حصولِ رزق کو محض اپنی کوشش تصوّر کرے اور حالات کی پیچیدگی میں اپنے ہاتھوں اپنے بچوں کو موت کے گھاٹ اُتارنے والوں کو یہ باور کروادیا کہ تمہیں رزق دینا یا تمہاری اولاد کو رزق دینا ہمارا (اللہ کا) کام ہے کہ جو پوری روئے زمین پر بے زبان جانوروں کو عطا کرتا ہے وہی اللہ تمہیں بھی رزق پہنچانے والا ہے۔

اس ضمن میں پیر کرم شاہ صاحب الازہری رقمطراز ہیں:

> ''تم رازق نہیں ہو نہ اپنے نہ ہی اپنے بال بچوں کے اور نہ کسی اور کے رزق رسانی کا بوجھ اپنے اوپر لاد کر تم خواہ مخواہ ہلکان ہو رہے ہو رازق تو میں (اللہ) ہی ہوں جو تمہارا خالق ہوں۔ میرے قبضۂ قدرت میں ہی رزق کے سارے خزانے ہیں۔ میں تمہیں بھی روزی دیتا ہوں اور تمہارے اہل و عیال کو بھی پالتا ہوں۔ تم ان دھندوں میں پھنس کر اپنی عمرِ عزیز برباد نہ کرو بلکہ اپنے انجام کی فکر کرو۔''[3]

---

[1] ھود،۱۱: ۶

[2] الانعام،۶: ۱۵۱

[3] الازہری، محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۳۹۹ھ، ج ۳، ص ۱۴۷

(ii) پاکدامنی و پاکبازی

مشرقی و مغربی ممالک بِلا امتیاز مذہب جس طرح اپنی جنسی خواہشات کے ہاتھوں ہلاکت کے دارِ بوار میں گرتے چلے جارہے ہیں، سنجیدہ و پاکیزہ فطرت لوگ اس سے عاجز و بے زار ہو چکے ہیں، مگر طُرفہ یہ کہ اسے گناہ یا اخلاقی جرم تصوّر تک نہیں کیا جاتا۔ بلکہ اکثر ممالک میں اس گناہ کو باقاعدہ حکومت کی پشت پناہی حاصل ہو رہی ہے۔ پاکدامنی اور پاکبازی کس شے کا نام ہے؟ عصمت، شرم و حیاء کسے کہتے ہیں؟ اُن کی جانے بلا! حالانکہ اسی اخلاقی بے راہ روی نے امراض و اسقام کی نئی نئی تباہ کاریوں کی وجہ سے معاشرے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے رکھا ہے مگر قانونی چارہ جوئی کے باوجود بے حیائی کی اس موج کے سامنے وہ بند نہ باندھ سکے۔ جب کہ دوسری جانب اسلام کی احتیاط ملاحظہ فرمایے:

لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى [1]

کہ زناکاری کے قریب بھی مت جاؤ۔

ان تین لفظوں میں حیاداری اور عفت و عصمت کا جو پیغام قرآن نے دے دیا ہے وہ اربوں ڈالر خرچ کرتے ہوئے بدکاری کا سدّ باب کرنے والوں کو بھی میسر نہ آسکا پھر یہاں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ یہ بھی نہیں کہا گیا کہ بدکاری نہ کرو بلکہ پاکباز معاشرے کی اساس کے لیے اس کے قریب پھٹکنے سے بھی روک دیا گیا ہے۔ امام فخر الدین رازی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"اذا قیل للإنسان لا تقربوا هذا فهذا اکد من أن یقول لا لا تفعله"[2]

کہ جب انسان سے یہ کہا جائے کہ اس کے قریب نہ جاؤ، تو یہ بات اُسے "یہ نہ کرو" کہنے سے بھی زیادہ تاکید والی ہوتی ہے۔

اندازہ کیجیے! قرآنی زندگی کی باطنی طہارت اور گناہوں سے احتراز کا، کہ وہ بوس و کنار، آنکھ بھر کے دیکھنا، شہوت سے نگاہ اُٹھانا تک گوارا نہیں کرتی تو براہِ راست اس گناہ کا ارتکاب کیسے کرنے دے گی اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے ہمیں محترمات کی ایک تفصیل دے کر رشتوں کی تقدیس و حُرمت کا پابند بنادیا ہے جب کہ غیر قرآنی زندگی میں پھوپھی، خالہ، ساس، سالی در کنار اپنی ماؤں اور بہنوں کی چادر کو داغدار کرنا بھی عیب شمار نہیں کیا جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ قرآنی زندگی کو جب اپنے لیے (معاذ اللہ) وبال، پابندی، جڑن، شدّت، اکراہ اور پاؤں کی بیڑی سمجھنے لگی تو لازماً مغربیت زدہ افکار کو ہیجان ملا اور ان کی فکر اسلامی معاشرے میں پنپنے

---

[1] بنی اسرائیل،۱۷: ۳۲

[2] الرازی، محمد بن عمر، الامام، مفاتیح الغیب، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۱ء، ج۷، ۳۳۱

لگی۔ نتیجتاً اخلاقی اقدار کا جنازہ نکل گیا۔ کیونکہ اہلِ مغرب اگرچہ بااخلاق سمجھے جانے لگے ہیں لیکن ان کا دائرۂ اخلاق چند قانونی ضابطوں سے شروع ہو کر چند معاشرتی خوبیوں پر ختم ہو جاتا ہے جب کہ ضرورت یہ ہے کہ اس حقیقت کو باور کیا جائے کہ قرآن و سنت کا بتایا اور سکھلایا ہوا دائرۂ اخلاق ہی دراصل حقیقی اور نفع بخش ہے جو ہر نہ صرف معاشرتی انسانی قدروں کا لحاظ رکھتا ہے بلکہ اُخروی نجات کی گارنٹی بھی پیش کرتا ہے۔

(iii) ہمہ جہتی مذہب

قرآنی طرزِ حیات اس لیے بھی محمود، مستحسن اور مطلوب ہے کہ اس نے زندگی کے تمام شعبہ جات: مذہب، تعلیم، تربیت، معیشت، ریاست، معاشرت، رویے، حقوق، واجبات، شخصی احوال، اعمال، عقائد، نظریات، رجحانات، احساسات، معقول شہوات، خاندان کے افراد کی ذمہ داری، اڑوس پڑوس کی خبر گیری، اہلِ علاقہ کی معاونت، منفی پہلوؤں پر تذکیر اور فہمائش الغرض زندگی کے تمام تر اسالیب پر تعلیمات و ہدایات کا ایک ایسا جامع دستور فراہم کیا جس کی مثال دنیا میں مفقود ہی کیا نا ممکن ہے۔ جب ایک باشعور، حق کا متلاشی ان حقائق سے واقف ہو جائے اور نورِ ایمان بھی نصیب ہو جائے تو ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ﴾ ہو جاتا ہے۔

(iv) اعتدال پسندی

قرآنی زندگی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کا مزاج اعتدال پسندانہ ہے، افراط و تفریط اور جانبداری سے بالکل پاک۔ جہاں حق اور صداقت ہو، تاریخ شاہد ہے کہ فیصلہ حق کی سربلندی کے ساتھ ہی ہوا ہے خواہ یہودی، نصرانی یا کمزور ہی کیوں نہ ہو جب کہ مذاہبِ عالم میں جہاں ظلم کے خلاف آواز اُٹھائی گئی اور قانون سازی عمل میں آئی تو اولاد کی سرزنش اور تربیت کے ضمن میں والدین تک کے ہاتھ باندھ دیے گئے اور دوسری جانب آزادیٔ اظہارِ رائے میں انبیائے کرام جیسی ذواتِ مقدسہ کے متعلق بھی ہرزہ سرائی کو تحفظ دے دیا گیا۔ اسی طرح عالمی طاقتوں نے اپنا ایجنڈہ اور دستور وضع کر رکھا ہے کہ جسے چاہا، جہاں چاہا اور جب چاہا الزامات کے بھنور میں پھنسا کر باوردی یلغار کا جواز تلاش کر لیا لیکن تعلیماتِ قرآنیہ کی روشنی میں انسان کو نہ تو انسانیت کش بننے دیا ہے اور نہ ہی بزدل اور ڈرپوک بلکہ زندگی کو ایسا توازن عطا کیا ہے کہ اپنانے والا ہی جانتا ہے۔

حکمِ ربانی ہے کہ:

وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا[1]

کہ جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں تم اللہ کے راستے میں اُن سے جنگ کرو اور حدّ سے تجاوز نہ کرنا۔

---

[1] البقرۃ،۲: ۱۹۰

اس آیتِ کریمہ اور ایسی بہت سے آیات میں قرآنی زندگی کے منہج کو پسند کرنے والوں کو دشمن کے مقابلے میں جذبۂ شجاعت عطا کیا گیا ہے لیکن بے جا اقدام سے ﴿لَا تَعْتَدُوْا﴾ کہہ کر سختی سے روک دیا گیا۔ لہٰذا ایک گال پر کوئی طمانچہ دے مارے تو دوسرے گال کو بھی پیش کر دینا قرآنی طرزِ حیات نہیں بلکہ اس کے بے جا اُٹھے ہوئے ہاتھ کو روکنا تعلیمِ مذہب، انسانی دانشمندی اور اعتدال پسندی ہے۔

(v) روحانیت سے بھرپور زندگی

قرآنی تعلیمات کا یہ اعجاز ہے کہ ان میں روح کی بقاء اور اس کے ارتقاء کا وافر سامان ہے۔ اگر کوئی مسلمان مجاہدات، ریاضات اور مراقبات تعلیمات کا ایک ذخیرہ ہے جو اپناتے چلے جانے سے روحانیت کا نور بھی دل میں پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور ہر ایسا شخص اپنی بساط اور کوشش کے موافق حصہ پاتا ہے۔ علاوہ ازیں دنیوی امور اور اکتسابِ معاش بھی اس روحانی دنیا کے مانع نہیں بلکہ قرآنی اور اسلامی زندگی میں اکتسابِ حلال بھی عین عبادت قرار دیا گیا ہے اور عبادت و ریاضت کا موجب ہوتی ہے جب کہ دوسری جانب وادی کفر یا غیر قرآنی زندگی میں جہاں طلبِ معاش ہوگی وہاں مادیت کے سوا کچھ نہیں ہوگا اور جہاں روحانیت کے حصول کے لیے خود ساز طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہاں دنیا اور معاش کی طرف اقدام کرنا جُرم بن جاتا ہے۔

قرآن تو وہ کتابِ روحانی ہے جس کی فقط تلاوت کرنا ہی روحانیت کا باعث بنتا ہے جیسا کہ مسلم کی حدیث میں اس کی صراحت بیان کی گئی ہے کہ:

> وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِي بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللهِ، يَتْلُونَ كِتَابَ اللهِ، وَيَتَدَارَسُونَهُ بَيْنَهُمْ، إِلَّا نَزَلَتْ عَلَيْهِمِ السَّكِينَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ [1]

> ترجمہ: جب افراد کا ایک گروہ اللہ کے کسی گھر میں اکٹھے ہوں جہاں وہ اللہ کی کتاب کو پڑھیں اور آپس میں اسے سیکھیں اور سکھائیں تو اُن پر سکون نازل ہوتا ہے۔ رحمت ان پر چھا جاتی ہے اور ملائکہ اُن کو ڈھانپ لیتے ہیں اور اللہ انھیں اپنے پاس موجود ملائکہ میں ان کو یاد کرتا ہے۔

قرآن کی تلاوت اور تعلیم کے تکرار کے نتیجہ میں سکون، رحمت اور ملائکہ کا نزول کامل طور پر روحانیت ہے۔ اندازہ لگایئے جس کی تمام زندگی قرآن کی تلاوت، تعلّم، تعلیم اور ذوقِ قرآن میں گزرے اس کی زندگی طہارت و پاکیزگی اور روحانیت کے کیسے درجہ پر فائز ہوگی۔

[1] ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، سنن بی داؤد، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن، الرقم ۱۴۵۵، ص ۲۱۵

(vi) تعظیم وتوقیر

زندگی کو جب اسلام اور قرآن کی خلعتِ فاخرہ نصیب ہو جائے تو بارگاہِ نبوی ﷺ کی تعظیم وادب بجا لانے سے والدین کے اکرام تک، قرآنی زندگی کا امتیازی وصف ہے۔

وَ تُعَزِّرُوْهُ وَ تُوَقِّرُوْهُ[1]

ترجمہ: ''اور ان کی مدد کرو اور ان کی تعظیم کرو۔''

اس میں تعظیمِ نبوی ﷺ کا حکم دیا گیا ہے اور والدین کی تعظیم و تکریم کے لیے فرمایا:

وَ اخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ[2]

ترجمہ: ''اور ان (والدین) کے لیے شفقت سے عاجزی کے پَر جُھکا دو۔''

جس زندگی میں قرآن کی ان تعلیمات کا چلن نہ ہو وہاں بڑھاپے میں تنہائی اور وحشت، قرابت داری کی لذتِ قرب، دُکھ درد میں شرکت سے دوری، ایک ایسا روکھا پن پیدا کر دیتی ہے کہ مغربی معاشرے کی مثال بن جاتی ہے۔ مغربی معاشرے میں تعظیم و توقیر کا وصف تو جب ہو کہ اس کا کوئی تصوّر یا تعلیم سماجی یا مذہبی طور پر دی جائے۔ یہ وصف بھی فقط اسلامی معاشرے اور قرآنی زندگی ہی کا امتیاز ہے۔

(vii) دیگر امتیازی اخلاقی اقدار

مذکورہ بالا اخلاقی اوصاف کے علاوہ بھی بہت سی ایسی خوبیاں اور امتیازات ہمارے اسلامی معاشرے اور قرآنی زندگی کا حصہ ہیں جنھیں کسی بھی معاشرے کے اختیار کرنے کی صورت میں صرف اسلام کی طرف ہی رجوع کرنا پڑتا ہے۔ شراب نوشی، سود، ہم جنس پرستی اور جوا وغیرہ ان کے ہاں اخلاقیات کے منافی نہیں حالانکہ یہ معاشرے کے بدترین رذائل ہیں جنھیں سختی سے روکا گیا ہے۔ اس کے علاوہ توکل، ماں باپ اور اولاد کے مابین حقوق و فرائض، شفقت و احترام، خانگی ذمہ داریاں، بیوی کے لیے نفقہ، سُکنٰی اور دیگر ضروریات پورا کرنے میں مرد کا قوّام ہونا ایسی خوبیاں ہیں جن کے ذریعے ایک قرآنی زندگی، غیر قرآنی زندگی سے ممتاز ہو جاتی ہے۔

قرآنی تعلیمات کی حقانیت پر غیر مسلم مفکرین کی آراء

غیر مسلم مفکرین نے اگرچہ اسلام کے خلاف علمی میدان میں انتہائی رکیک حملوں سے اسے زک پہنچانے کی کوشش کی ہے تاہم یہ قرآن کا اعجاز ہی ہے کہ ان میں سے ایک خوش نصیب گروہ ایسا بھی ہے جس

---

[1] الفتح، ۴۸: ۹

[2] بنی اسرائیل، ۱۷: ۲۴

نے اس کے حق میں قلم اُٹھا کر مسلمانانِ عالم کو ممنون کیا ہے۔ ان میں سے چند مفکرین کی آراء ذیل میں قرآنی تعلیمات کی طرف بڑھنے کے لیے مؤثر ثابت ہو گی۔ چنانچہ ایڈون یوک (Adwan Yok) لکھتا ہے:

''قانونِ محمدی یعنی قرآن ایک ایسا قانون ہے جس میں سربراہِ مملکت سے ادنی رعیت تک کا قانون موجود ہے۔''[1]

ماماڈیوک پکھتال قرآنی تعلیمات کے حق میں اپنی رائے بیان کرتا ہے کہ:

''وہ قوانین جو قرآن میں درج ہیں اور جو پیغمبر ﷺ نے سکھائے، وہی اخلاقی قوانین کا کام دے سکتے ہیں اور اس جیسی کوئی اور کتاب صفحۂ عالم پر موجود نہیں ہے۔''[2]

مورس بکائلے قرآن کی سرمدی، آفاقی اور عالمگیری تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''قرآن حکیم میں ایک بھی بیان ایسا نہ تھا جس پر جدید سائنس کے نقطۂ نظر سے حملہ کیا جاسکتا ہو۔''[3]

برنارڈ شاء قوانینِ اسلام اور تعلیماتِ قرآن کی فوقیت کا اظہار یوں کرتا ہے کہ:

''میں کسی ایسے دین یا اجتماعی نظام کو نہیں جانتا جو اسی قسم کے عمدہ قوانین اور تعلیمات پر مشتمل ہو جن پر اسلام مشتمل ہے۔''[4]

ان بیانات سے قرآنی تعلیمات کی اثر انگیزی، حقانیت اور صداقت کے ساتھ ساتھ ان کی ہمہ جہتی کا کھلے بندوں اعتراف ہے جس نے انسان کے اخلاق و کردار سے سربراہِ ریاست کے لیے قانون سازی تک بیان کر دیا ہے۔ مورس بکائلے نے سائنسی تعلیمات کے اعتبار سے قرآن کو بائبل پر ترجیح دیتے ہوئے اپنی تصنیف بائبل، قرآن اور سائنس میں لکھا ہے کہ:

''قرآن کریم میں مقدس بائبل سے کہیں زیادہ سائنسی دلچسپی کے مضامین زیر بحث آئے ہیں۔ بائبل میں یہ بیانات محدود تعداد میں ہیں لیکن سائنس سے متباین ہیں۔ اس

---

[1] قاسمی، محمد شکیب، ڈاکٹر، قرآن اور مستشرقین، حجۃ الاسلام اکیڈمی، سہارن پور، ۲۰۱۷ء، ص ۳۱

[2] ایضاً، ص ۴۵

[3] ضیاء النبی، ج ۶، ص ۲۰۷

[4] ایضاً، ص ۲۱۱

کے برخلاف قرآن میں بکثرت مضامین سائنسی نوعیت کے ہیں اس لیے دونوں میں کوئی مقابلہ نہیں۔"[1]

وہ لوگ جن کا کام قرآن پر بے سروپا اعتراضات کی بوچھاڑ کرنا، الزامات لگانا اور طعن کرنا تھا، ان کے قلم اور زبانیں اگر قرآن، تعلیماتِ قرآن اور ان تعلیمات کو اپنانے کی خیر جانتے ہیں، تو کس قدر حق ہے اُن فرزندانِ اسلام کا جو اسے زندگی کا بہترین دستور، آئینِ حیات اور منشور سمجھنے کے ساتھ ساتھ اپنے حقیقی خدا کا بہترین تحفہ اور اپنے نبی ﷺ کا معجزہ بھی سمجھتے ہیں۔

قرآنی زندگی کے فوائد

اپنے رب کے فرامین کے مطابق جس کسی نے زندگی کو ان مبارک راہوں پر ڈالا، وہ نہ تو اس دنیا میں ناکام ہوا اور نہ ہی آئندہ زندگی میں ناکام ہوگا۔ قرآن نے ایسے لوگوں کے لیے جس فلاح کی ضمانت کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے اس کا تعلق جس طرح دنیا کے ساتھ ہے اسی طرح آخرت کے ساتھ بھی ہے۔ لہٰذا وہ شخص جس نے قرآنی تعلیمات کے سانچے میں خود کو ڈھال لیا اُسے دنیا میں بھی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی۔ ذیل میں ان منافع میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(i) دنیوی فوائد

- لادینیت، ملحدانہ اور مشرکانہ عقائد و اعمال سے بچاؤ حاصل ہو جاتا ہے۔
- تجارت، لین دین اور دیگر امورِ حیات میں لوگوں کے اعتماد کی فضا قائم ہوتی ہے۔
- اخلاقی پستی، تہذیبی گراوٹ اور کردار کے انحطاط سے تحفظ حاصل ہو جاتا ہے۔
- شرم و حیاء، عفت و پاکدامنی اور پاکبازی کی شریفانہ زندگی گزارنے کا موقع ملتا ہے۔
- قرابت داروں اور اربابِ محنت میں احترام و شفقت کی وجہ سے خوب عزت و تکریم اور اعتماد حاصل ہوتا ہے۔
- خانگی زندگی خوشحال اور پُرسکون ہو جاتی ہے۔
- دُکھ درد کی گھڑیوں میں قدردان اور محسنین کا ساتھ نصیب رہتا ہے۔

(ii) اُخروی فوائد

دنیوی معاملات میں منفعت کے ساتھ ساتھ اُخروی طور پر کامرانیاں ہی کامرانیاں نصیب ہوں گی۔

[1] مورس بکائیلے، دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس، مترجم: ثناء اللہ صدیقی، بائبل، قرآن اور سائنس، ص ۱

- دائمی و وقتی تاب سے حفاظت۔
- یومِ آخرت میں عزّت افزائی اور خصوصی مہربانی۔
- موت میں آسانی۔
- حساب میں آسانی۔
- جنت میں داخلہ اور ان گنت انعام و اکرام۔

نتیجۂ بحث

ان تمام مباحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ زندگی کی حقیقت اور تخلیقِ انسانی کا مقصد فقط دنیا کی رونق اور ترنگ نہیں بلکہ اسے متاعِ حیات سمجھتے ہوئے احکامِ خداوندی کی تعمیل میں حقیقی زندگی کا وجدان ہے۔ تمام شعبہ ہائے حیات میں رہنمائی صرف عقل سے حاصل کرنا دانشمندی نہیں اور یوں بھی انسان کی سوچ، عقل اور دانش محدود ہے لہٰذا اس کے مقصدِ علیا کو پانے کے لیے اُسی کی تعلیمات و رہنمائی کی طرف رجوع کیا جائے جو اس کا خالق ہے۔

جلبِ مال، ہوسِ دنیا، عدم توجہی، فقر و افلاس اور عہدِ حاضر کی لامحدود خرافات نے اگرچہ انسان کو احکامِ خداوندی کی تعمیل سے دور کر دیا ہے لیکن اگر دیکھا جائے تو عیسائیت، یہودیت، ہندومت اور بدھ مت جیسے دنیا کے بڑے مذاہب کے پاس بھی زندگی کے تمام ترجہات کے لیے آخر کیا تعلیمات اور عملی مظاہر ہیں؟

علاوہ ازیں اتباعِ احکام سے دوری نے انسان میں اخلاقی بے راہ روی، دین سے برگشتگی، سماجی معاملات میں بگاڑ اور معاشرتی ناہمواریوں کے سوا ہمیں کیا دیا ہے۔

دوسری جانب قرآن کا عالمگیر پیغام، دلنشین اسلوب اور صداقت پر مبنی تعلیمات نے معاشرے کو عصمت و عفت، توکل، اعتدال و میانہ روی، روحانیت، رشتوں کا تقدس اور دیگر اخلاقی اقدار عطا کرتے ہوئے انقیاد و عبادات کا حسین عملی نور عطا کیا ہے کہ مذاہبِ عالم اس کی مثال لانے سے قاصر ہیں۔

قرآنی تعلیمات کو اپنانے اور اپنی زندگی پر اس کے اطلاق کی حمایت میں مغربی مفکرین بھی بسا اوقات اپنی مثبت رائے سے اس کی عظمتوں کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں اور بندۂ مومن کو قرآنی زندگی اختیار کرنے میں نہ صرف اخروی منافع حاصل ہونے والے ہیں بلکہ دنیا میں بھی اس کے ڈھیروں فوائد ہیں۔

منابع

۱. قرآن کریم

۲. الاصفہانی، حسین بن محمد الراغب، العلامہ، المفردات فی غریب القرآن، قدیمی کتب خانہ، کراچی

۳. الخازن، علی بن محمد البغدادی، لباب التاویل فی معانی التنزیل، دارالکتب العلمیۃ، بیروت

۴. زندگی کے ۲۰ عظیم سبق، مترجم: محمد احسن بٹ، Hall Uthan,Life's Greatest Lessons، دارالشعور، لاہور، ۲۰۱۰ء

۵. اشفاق احمد، انسان کا مقام اور مقصدِ حیات، مثال، لاہور، ۲۰۰۵ء

۶. البخاری، محمد بن اسماعیل، الامام، الجامع الصحیح البخاری، قدیمی کتب خانہ، کراچی، کتاب الجنائز، باب ما قیل فی اولاد المشرکین

۷. البیہقی، احمد بن حسین ابو بکر، الامام، شعب الایمان، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۳ء

۸. امیر علی، سیّد، ڈاکٹر، روحِ اسلام، مترجم: محمد علی چراغ، نذیر پبلشرز، لاہور

۹. فاروقی، برہان احمد، ڈاکٹر، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۹ء

۱۰. شیبۃ الحمد، عبدالقادر، الادیان والفرق والمذاہب المعاصرۃ، مترجم: ابو عبداللہ محمد شعیب، اقوامِ عالم کے ادیان و مذاہب، مسلم پبلی کیشنز، گوجرانوالہ، ۲۰۰۷ء

۱۱. الازہری، محمد کرم شاہ، پیر، ضیاء النبی، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۱۴۱۸ھ

۱۲. نائیک، محمد ذاکر عبدالکریم، ڈاکٹر، قرآن پاک افسانہ یا سچی وحی، مترجم: زاہد کلیم، رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۲۰۱۴ء

۱۳. الرازی، محمد بن عمر، الامام، مفاتیح الغیب، داراحیاء التراث العربی، بیروت، ۲۰۰۱ء

۱۴. ابوداؤد، سلیمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن، الرقم ۱۴۵۵

۱۵. قاسمی، محمد شکیب، ڈاکٹر، قرآن اور مستشرقین، حجۃ الاسلام اکیڈمی، سہارن پور، ۲۰۱۷ء

۱۶. مورس بکائلے، دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس، مترجم: ثناء اللہ صدیقی، بائبل، قرآن اور سائنس